# قرآن مجید کا طرزِ استدلال

از جناب مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب کانپوری

آفتاب کی روشنی، برف کی برودت، آگ کی حرارت اور اسی قسم کے دوسرے بدیہی حقائق و واقعات کے متعلق کبھی آپ نے اپنی قوتِ فکریہ کو دعوتِ نظر و فکر دی ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو اسکی وجہ کیا ہے؟ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے علم و یقین کا حصول، استدلال و استنتاج کا محتاج نہیں ہے، بلکہ بغیر کسی نظر و فکر کے ہمارا ذہن ان اشیاء کا علم و یقین حاصل کر لیتا ہے۔

اس مثال سے اس حقیقت واقعی کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ استدلال و تفکر خود مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ دراصل مقصود بالذات علم اور اذعان و یقین ہے دلائل و براہین تو محض اس مقصد کے حصول کے ذرائع اور وسائل ہیں جب ہمارے ذہن پر جہل، شک، اور وہم کی تاریکیاں مستولی ہو جاتی ہیں تو وہ فکر و استدلال کی شمع جلا کر اُن کو دور کرنا چاہتا ہے، اور جب علم و یقین کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو اس شمع کو گل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ حصول مقصود کے بعد ذرائع صرف بیسود ہی نہیں ہو جاتے، بلکہ "العلم حجاب اکبر" کے تحت داخل ہو کر اصل مقصد سے انسان کو غافل کر دیتے ہیں۔

اس ضروری اور مسلّم نکتہ کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے انسان کی قوتِ فکر غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے جسکا نتیجہ ابدی گمراہی اور ضلالت ہے۔ وہی مسافر منزل تک پہنچ سکتا ہے

جو منزل کو مقصود بنائے ۔ اور جو مسافر راستہ کو مقصد قرار دے ، یا وسیلۂ سفر کا گرویدہ ہو، اُسکا منزل تک پہنچنا برات عاشقاں بر شاخِ آہو کا مصداق ہے جہلائے عرب نے اسی غلطی کا شکار ہو کر کہا تھا :

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ — کیوں نہ اس نبی پر کوئی خزانہ اترا یا اسکے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا؟

اگر وہ یہ سمجھتے کہ دلائل خود مقصود بالذات نہیں ہیں اس لیے انکی کسی خاص نوع پر زور دینا غایت درجہ کی سفاہت وحماقت ہے، تو ایسی مہمل بات کبھی نہ کہتے ۔

عجیب بات یہ ہے کہ عرب کا وحشی جس ذہنی مرض میں آج سے ۱۳ سو برس پہلے مبتلا تھا اسی میں بیسویں صدی کی علمی فضا میں پرورش پانے والا یورپ کا فلسفی بھی مبتلا ہے اسکی غلطی کا منشار بھی بعینہٖ وہی ہے جو جہلائے عرب کی غلطی کا تھا اور اسکی گمراہی و ضلالت کا سبب بھی وہی ہے جو اس بدوی کی گمراہی کا تھا۔ فرق صرف مطالبہ کی نوعیت کا ہے عرب کا بدوی، نبی اُمّی فداہٗ ابی و امی کی صداقت کے لیے فرشتوں کی ہمرکابی اور سیم و زر کے انبار ضروری سمجھتا تھا۔ یورپ کا فلسفی اور اُسکا ہندوستانی متبع یہ نہیں طلب کرتا بلکہ منطق کی کسوٹی پر کسے ہوئے دلائل طلب کرتا ہے ۔ جب تک کسی مسئلہ پر منطقی دلیل نہ پیش کی جائے اس وقت تک وہ اسکو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے ۔ خطابیات سے کام لینے والے کو وہ لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔ تمثیل اسکے نزدیک مردود ہے ۔ استقراء اسکی رائے میں ظنّی شے ہے۔ شکل اوّل کے سوا اسکے نزدیک علم و یقین تک پہنچنے کی کوئی شکل نہیں ہے ۔

فن منطق کی تنقید ہماری بحث سے خارج ہے ۔ ہمیں فقط یہ کہنا ہے کہ یقین و اذعان کا تعلق انسان کے نفس سے ہے ۔ لہٰذا اسکا سرچشمہ خود انسان ہی میں تلاش کرنا چاہیے

علم کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے۔ اسکی فطرت نے منزل عرفان و ایقان تک پہنچنے کے لیے خود کچھ راہیں مقرر کی ہیں۔ ہمیں انہی راہوں کو تلاش کرنا چاہیے اور انہی پر چل کر اپنی اس فطری خواہش کو پورا کرنا چاہیے۔ استدلال کے نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر کے فقط اسکے ظاہری پہلو پر زور دینا ضلالت و گمراہی کا پیش خیمہ ہے۔ اگر ہر لمحہ اصل مقصد کو پیش نظر رکھا جائے تو اس غلطی سے حفاظت ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید سراپا رشد و ہدایت ہے۔ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ۔ ادنیٰ درجہ کی غلطی کا صدور بھی اس سے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ اصل مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے اور ہر اس طریق استدلال سے کام لیتا ہے جو مقصد کے حصول میں مددگار ہو، قطع نظر اس کے کہ منطقی کی نگاہ میں اس کے استدلال کی کیا حیثیت قرار پاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کسی خاص طرزِ استدلال کا پابند نہیں ہے، بلکہ وہ فطرت انسانی کی طلب کا پابند ہے۔ انسانی فطرت مواقع اور معلومات کے تنوع کے لحاظ سے طریق استدلال میں تفنن چاہتی ہے اور علم و یقین کے کاخ بلند پر پہنچنے کے لیے مختلف مواقع پر مختلف زینے استعمال کرتی ہے۔ کتاب مبین اس کے اس فطری تقاضے کو قبول کرتی ہے اور اسی کے مطابق حجت و استدلال پیش کرنے میں تنوع اور تفنن پیدا کرتی رہتی ہے۔ قرآن کوئی خشک مزاج فلسفی نہیں ہے جو اپنی روکھی پھیکی اور بے محل تقریر سے مخاطب کے دل و دماغ کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دے بلکہ وہ ایک شفیق و حکیم معلم ہے جو متعلم کو اسکے نفسیاتی و فطری راستہ سے علم و یقین کی منزل تک لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا ہے کہ میں کوئی نئی چیز لیکر دنیا میں آیا ہوں، بلکہ وہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں ذکر اور تذکرہ ہوں یعنی خدا کی جو معرفت اور صراطِ مستقیم سے جو اُنس آدمی کی فطرت میں موجود ہے اسی کو میں

نمایاں کرنے آیا ہوں - اُسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانا چاہتا ہوں جسکی بنا پر انسان نے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں بلیٰ کہا تھا، جس کو وہ دنیا کی غفلت انگیز اور سکر آلود فضا میں آکر بھول گیا - قرآن کی رو سے انسان کی فطرت نہ تو جاہل ہے اور نہ گمراہ - اس کو علم اسی روز دیا گیا تھا جس روز اسے پیدا کیا گیا تھا - اسے فجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں دکھادی گئی تھیں - اب یہ دوسری بات ہے کہ مادّہ اور مادّیات کے حجابات کی وجہ سے آج وہ ذہول کے مرض میں گرفتار ہو گیا ہے - اس کا ذہن آئینہ کی طرح ہے - جو شے بھی اس کے سامنے آئیگی وہ اس میں مرتسم ہو جائیگی - مگر یہ آئینہ زنگ آلود ہو گیا ہے، اسلیے اسکو حقائق و معارف کا ادراک کرنے اور علم و یقین حاصل کرنیکے لیے صرف اسکی ضرورت ہے کہ اس آئینہ کے زنگ کو دور کر دیا جائے - موانع اور حجابات معلومات کی جانب سے نہیں ہیں بلکہ خود متعلم کی جانب سے ہیں اگر قلب پر سے غلاف اتار دیا جائے تو وہ پھر علوم و معارف کا گنجینہ بن جائیگا - فرقانِ حمید انہیں حجابات کو اٹھا دیتا ہے اور ذہنِ انسانی کے زنگ آلود آئینہ کو صاف کر دیتا ہے - اُسکا کمال یہی ہے کہ وہ معلومات کو ذہنِ انسانی میں باہر سے ٹھونستا نہیں ہے بلکہ قلبِ انسانی پر انگلی رکھکر بتا دیتا ہے کہ یہ عقیدہ اس مقام پر تحریر ہے اور اس چیز کی شہادت یہاں موجود ہے - وہ استدلال میں ایسے ہی مقدمات لاتا ہے جنکی صداقت پر فطرتِ انسانی خود مہر تصدیق ثبت کر چکی ہے، اور انہیں فطری، واضح، اور بے خطر راستوں سے وہ انسان کو علم و یقین کی منزل تک لے جانا چاہتا ہے -

ان راستوں کا تعدد کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں ہے - صرف حواس ظاہرہ کی مثال ہی اس مسئلہ کی وضاحت کیلیے کافی ہے - ہمارے ہر حاسّہ کے محسوسات جدا اور طرقِ احساس مختلف ہیں - آنکھ کسی اور طرح محسوس کرتی ہے اور کان کسی اور طرح - آنکھ کے

محسوسات اور ہیں اور کان کے اور۔ یہ تو معلومات کی صرف ایک نوع کی اقسام کا باہمی تفاوت ہے۔ دوسری انواع کے لیے "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"۔ قرآن مجید جو فطرت سلیمہ کا ترجمان ہے اس اختلاف و تنوع کو کس طرح نظر انداز کرسکتا تھا۔ وہ علم و ہدایت کی منزل تک پہنچنے کے لیے انسان کے فطری و جبلی راستہ کے متوازی راستہ بناتا ہے۔ اس لیے علم و یقین کے فطری سرچشموں کو معلوم کرلینا قرآن مجید کے طرزِ استدلال کو معلوم کرلینے کے مترادف ہے۔ لیکن اسکے لیے تمہیداً چند امور کا جاننا ضروری ہے۔

گذشتہ بیان سے یہ تو واضح ہو گیا کہ انسانی فطرت خود تعقل و ادراک کی قوت رکھتی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے جسکے لیے کسی بیان کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قدرت نے انسان کو قوت ادراک و تعقل عطا کیوں کی ہے؟ یا بالفاظ دیگر اس قوت کا صحیح مصرف کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق الگ الگ دیتا ہے ایک سائنسداں سے یہ سوال کرو تو وہ کائنات کے مواد و خواص اور قوانین قدرت کے کشف و ظہور کو عقل کا منتہائے نظر قرار دیگا۔ ایک فلسفی حقائق اشیاء کے علم کو قوتِ فکر کی معراج کہیگا۔ ایک سیاست داں اسرارِ حکمرانی معلوم کرنیکو اسکی غرض و غایت بتائیگا۔ مگر تم خود سمجھ سکتے ہو کہ یہ جوابات عقل انسانی کے دائرۂ عمل کو کسقدر تنگ کر دیتے ہیں؟ سفر زندگی میں قدم قدم پر ہم عقل کی رہنمائی کے محتاج ہیں اس لیے عقل کا تعلق ہماری زندگی کے کسی مخصوص شعبہ سے ہونا بالکل بعید از عقل ہے۔ اسکا دامن تو ہمارے وجود و بقاء کے دامن کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ہمارے وجود و بقاء کی ہر شاخ اسکے احاطۂ عمل میں داخل ہے۔ اس وسیع دائرہ کے حدود حصول منفعت اور دفع ضرر ہیں۔ یعنی فطرت انسانی اپنی قوت

تعقل و ادراک کو کسی نفع کی تحصیل یا کسی ضرر و نقصان کے دفع کرنیکے لیے استعمال کرتی ہے اور یہی اسکا مصرف ہے۔

اس اصول کی روشنی میں قوت عاقلہ کا فطری مقصد استعمال اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ انسان کی قوتِ فکر کی ہر وہ حرکت جسکی محرک خود فطرت انسانی ہو اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر ہوتی ہے۔ اسلیے انسان نہج حرکت بھی ایسا ہی متعین کرتا ہے جو اسکے مقصد سے کوئی ربط و تعلق رکھتا ہو، اور ایسے مقدمات کو استعمال کرتا ہے جنکا تعلق اسکی کسی خاص منفعت سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فطرت علم و یقین حاصل کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل راستے استعمال کرتی ہے:۔

اقتضاءِ فطری۔ اسکی شرح یہ ہے کہ انسانی فطرت جس شے کی طلب رکھتی ہے اسکے موجود ہونے کا یقین بھی ساتھ ہی اسکو حاصل ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ طلب خالص فطری ہو، صنعت اور تکلف کو اس میں دخل نہ ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسکے متعلق بداہتہ کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کا یقین جس طرح ایک پا بہ گور بوڑھے کو ہوتا ہے اسی طرح ایک بچے کو بھی ہوتا ہے اور جس طرح ایک دقیقہ رس فلسفی اس حقیقت کا یقین رکھتا ہے اسی طرح ایک جاہل و سادہ لوح دہقان بھی اسکا اذعان رکھتا ہے۔ اسلیے کہ یہ حقیقت لوحِ فطرت پر جلی نقوش سے تحریر ہے اور فطرت انسانی کا اقتضاء ہر فرد میں یکساں ہوتا ہے مثلاً غذا کی خواہش ہماری فطری خواہش ہے، اسلیے ہمکو بدو طفولیت سے لیکر وقت نزع تک اس امر کا یقین رہتا ہے کہ دنیا میں غذا کے نام کی کوئی نہ کوئی شے ضرور موجود ہے۔ گو ہمکو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے دہن و گلو سے اس قسم کی حرکات کا اظہار کرتا ہے جو طلب غذا پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اسکو غذا کے وجود کا یقین

نہیں ہے تو اسکی ان حرکات کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی علم النفس کا جاننے والا اس چیز کو تسلیم کرنیکے لیے تیار ہوسکتا ہے کہ کسی شئے کے وجود کو تسلیم کیے بغیر بھی اسکے حصول کی کوشش ہوسکتی ہے؟ یہ یقین بالکل فطری ہوتا ہے - البتہ اس بات کا علم کہ یہ مطلوب کہاں ہے اور کیا ہے، اس کا تعلق فطرت سے نہیں بلکہ عقل سے ہے اور اسکے لیے غور و خوض اور تلاش و جستجو کی حاجت ہوتی ہے -

غرض انسانی فطرت اس چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جس چیز کی اسکو خواہش ہو وہ موجود نہ ہو- کیونکہ اس کا اقتضاء غلطی پر مبنی نہیں ہوسکتا - دیکھو قرآن مجید نے اس فطری اصول استدلال سے کس طرح کام لیا ہے - وجود باری تعالیٰ پر استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے :

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ — وہ کون ہے جو مجبور کی دعا قبول کرتا ہے اور

وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ - تکلیف کو دور کرتا ہے -

استمداد انسان کا ایک فطری وصف ہے - وہ ایک ایسی شئے کا ہمیشہ طالب رہتا ہے جو اسکو اضطراب، پریشانی اور تکلیف سے نجات دیکر سکون و راحت سے ہم آغوش کردے جب اطمینان و راحت کے کل اسباب منقطع ہوجاتے ہیں تب بھی اسکا یہ فطری اقتضاء باقی رہتا ہے - اور اس وقت وہ ایک ایسی ہستی سے فطرتاً آس لگاتا ہے جو فانی علل و اسباب سے بالاتر ہو اور ظاہری اسباب کی قیود سے آزاد ہوکر اسکے خوف و یاس کو امن و امید سے بدل دے - ظاہر ہے کہ وہی ہستی جو اسباب کی پابندیوں سے آزاد ہو خدا کے نام سے موسوم کی جاتی ہے - کتاب مبین کا منشاء یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کا تصور ہماری فطرت میں داخل ہے جو علل و اسباب کی قیود سے بالاتر ہو، جو مایوسوں کی امیدگاہ، پریشان و مضطر کی پناہ

اور بیکسوں کی فریاد رس ہو، اور جس کی قوت و طاقت کا دائرہ ہمارے دائرۂ تصور و خیال سے وسیع ہو۔ یہ ہماری فطرت کا اقتضاء ہے جو غلط نہیں ہو سکتا اور یہ نقوش ہماری لوحِ فطرت پر ازل سے ثبت ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ مادّی حجابات ان نقوش کو پوشیدہ کردیں۔ لیکن یہ قطعاً محال ہے کہ کوئی قوت ان روشن نقوش کو مٹانا تو درکنار دھندلا بھی کرسکے اور قرآن یہی چاہتا ہے کہ ان دبے ہوئے نقوش کو ابھار دے۔

فرقان حمید نے ایک دوسرے فطری راستہ سے بھی انسان کو اس مقصد تک پہونچانے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (جان لو کہ صرف اللہ ہی کی یاد سے اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے) انسان فطرتاً صرف اُسی شے کے یقین کرنے پر مجبور رہتیں ہے جبکا وہ فطرتاً خواہشمند ہوتا ہے، بلکہ وہ اُس شے کے وجود کا یقین کرنے پر بھی مجبور ہے جو اسکے فطری مقصد کے حصول میں معاون ہو۔ یہ فطرت کا دوسرا استنتاج ہے جس سے فرقان حمید نے یہاں کام لیا ہے۔

اطمینان قلب انسان کا ایک فطری مقصد ہے اور اتنا مہتم بالشان مقصد ہے کہ انسان اپنے کل افعال صرف اسی مقصد کے لیے انجام دیتا ہے۔ اس مقصد کا حصول محبت پر موقوف ہے۔ کیونکہ اطمینان نام ہے قلب کی یکسوئی اور ایک ہی جانب مائل ہو جانیکا اور اس کیفیت کا حصول صرف محبت ہی سے ہو سکتا ہے، اور عقلاً محبت صرف اُس شے سے ہو سکتی ہے جو ہر کمال سے متصف اور ہر عیب سے پاک ہو۔ ایسی ہی ذات کا نام خدا ہے۔

فطرت کے یہ طرق استدلال صرف ان معلومات کا اذعان و یقین حاصل کرنے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں جنکے علم کے لیے کسی خاص صلاحیت و قوت کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ ہر انسان اپنی سعی و کوشش سے ان کو حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن معلومات کی ایک دوسری قسم

بھی ہے جسکے علم کے لیے مخصوص صلاحیت و استعداد کی حاجت ہوتی ہے اور وہ خاص خاص اشخاص ہی میں پائی جاتی ہے، عام انسان اس سے خالی ہوتے ہیں۔ اس قسم کے معلومات کا علم و یقین ان انسانوں کو کس طرح حاصل ہو سکتا ہے جو کسی وجہ سے وہ قوت نہیں رکھتے ؟ اسکی جانب ہماری روزمرہ کی زندگی رہنمائی کریگی۔

اگر مکۂ مکرمہ کی زیارت ہمکو نصیب نہیں ہوئی ہے اور ہم اسکے حالات و کوائف کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے حالات کسی ایسے شخص سے دریافت کرتے ہیں جو شرفِ زیارت حاصل کر چکا ہو۔ اگر ہم فن طب سے ناواقف ہیں تو ہمکو اپنی صحت اور اپنے مرض کے متعلق کسی طبیب کے فیصلہ پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم فن تعمیرات کو نہیں جانتے تو ہم کو کسی انجنیر کی رائے پر یقین لانا پڑتا ہے۔ ان جزئیات سے ہم یہ کلیہ بنانے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ جن چیزوں کا علم آدمی کے اندر کسی مخصوص صلاحیت و استعداد کا طالب ہو، اور وہ صلاحیت کسی انسان میں نہ پائی جائے، تو ایسے شخص کے لیے ان کا علم حاصل کرنے کا فطری ذریعہ "خبر" ہے، یعنی جاننے والے کی دی ہوئی اطلاع۔ چونکہ یہ طریقہ ایک فطری طریقہ ہے اسلیے خارجی اشیاء مثلاً عمر، قوم، مرتبہ وغیرہ کے اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جسطرح ایک معمر شخص کا ذریعۂ علم خبر ہوتا ہے اسی طرح ایک بچہ بھی ایسی چیزوں کا علم اپنے بزرگوں سے پوچھ کر ہی حاصل کرتا ہے۔ جس طرح ایک جاہل دہقان ایسی اشیاء کا علم خبر سے حاصل کرتا ہے اسی طرح ایک عالی دماغ فلسفی بھی ایسے معاملات میں خبر پر ہی اعتماد کرتا ہے۔

کسی انسان سے اگر اسکی قوت و طاقت سے زائد بوجھ اٹھوایا جائے تو اسکے اعضاء کی شکل بگڑ جاتی ہے اور اسکی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ایک کمزور مریض کو اگر ثقیل غذائیں

کھلائی جائیں تو اسکی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے - اسی طرح اُن امور کا علم حاصل کرنے کے لیے ہماری جد و جہد، جنکی براہ راست تحصیل کی صلاحیت ہم میں نہیں ہے، اور جنکے حصول کا فطری ذریعہ صرف خبر ہے، نہ صرف یہ کہ ہم کو گمراہی و ضلالت میں مبتلا کر دیتی ہے، بلکہ اس سے ہمارے علمی و فکری قویٰ بھی طاقت سے زیادہ بار اٹھانیکی وجہ سے ماؤف ہو جاتے ہیں، اور آئندہ کے لیے ہم پر علم و یقین کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ جہاں قیامت اور حشر و نشر کا تذکرہ آیا ہے وہاں کتاب مبین نے اسکے امکان پر دلائل تو قائم کیے ہیں لیکن اسکے وقوع کو اور اسکی کیفیت کو دلائل سے ثابت نہیں کیا بلکہ اسکے لیے کتاب اور صاحب کتاب کی شہادت پیش کی ہے -

تم دیکھو گے کہ قرآن حکیم نے مسئلہ رسالت کو نہایت اہتمام اور کثرت و تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے - اسکی وجہ یہی ہے کہ مسائل دین کے ایک کثیر حصہ کا علم خبر پر موقوف ہے - اسلیے قرآن مجید نے دین کی اس فطری بنیاد کو مستحکم و مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے اس بنیاد کا استحکام دو چیزوں پر موقوف ہے - خبر کا امکان عقلی - مخبر پر اعتماد -

خبر کے امکان سے مراد یہ ہے کہ وہ اجتماع نقیضین کو مستلزم نہ ہو - اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی چیز کا مستبعد ہونا اور اس کا محال ہونا، یہ دونوں ہم معنی نہیں ہیں - یہ ایک عام غلطی ہے (جس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ مبتلا ہے) کہ مستبعد اور محال کو ایک ہی درجہ دیا جاتا ہے - بہت سی چیزیں ممکن ہیں مگر مستبعد ہیں - بہت سی چیزیں کل تک مستبعد تھیں مگر آج انکا وقوع ہو رہا ہے - مثلاً ریڈیو اور ہوائی جہاز وغیرہ - لہذا انسان کا کسی چیز کو بعید از عقل سمجھنا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں کہ وہ ہو نہیں سکتی -

مخبر پر اعتماد کی یہ صورت ہے کہ اسکا صحیح العقل اور صادق ہونا معلوم ہو - اگر مخبر کا

صحیح العقل اور صادق ہونا یقینی ہے، اور اسکی خبر دائرۂ امکان سے باہر بھی نہیں ہے تو ہماری فطرت ہمکو مجبور کرتی ہے کہ ہم اسکی خبر پر یقین کریں۔ اگر ان شرائط کے باوجود ہم اسکی خبر میں شک کریں تو اسکے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اپنی فطرت کے خلاف جا رہے ہیں۔ اور فطرت کی مخالفت کرنے والے کی عقل و بصیرت کسی عقل والے کے نزدیک قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتی۔

مسئلۂ قیامت کا تذکرہ تو ہم نے مثال کے طور پر کر دیا ہے، ورنہ قرآن مجید نے کیفیت یقین پیدا کرنیکا یہ روشن راستہ متعدد مقامات پر اختیار کیا ہے۔ اسی فطری طریق سے اُسنے انسان کو یوم الست کے بہت سے عہود و مواثیق یاد دلائے ہیں۔ لیکن یہی مثال وضاحت کے لیے کافی ہے۔ اس مثال پر غور کرو۔ قرآن حکیم نے قیامت کے امکان پر عقلی دلائل و براہین قائم کیے۔ مگر اسکے وقوع کے لیے اپنے اور رسول کے بیان کو کافی سمجھا۔ رسول کی صداقت کو بار بار ثابت کیا اور اس میں شک و ریب کے دونوں راستے مسدود کر دیئے، یعنی رسول کی فراست و دانشمندی کو دلائل قاہرہ اور براہین باہرہ سے ثابت کیا اور انکی صداقت و دیانت کو بھی روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا۔ اس فطری استدلال کے بعد حشر و نشر کے وقوع میں شک کرنیکی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اور فطرت سلیمہ اسکے یقین کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کے کل طرق استدلال اور فطرت کے کل مناہج احتجاج کا بتانا یہاں مقصود نہیں ہے۔ یہاں تو نمونتہً چند چیزوں کو پیش کر دیا گیا ہے جن سے اس امر کا واضح کرنا مطلوب ہے کہ قرآنی طرزِ استدلال فطرت انسانی کے کس قدر مطابق ہے۔ قرآنی طرزِ استدلال سمجھنے کے بعد فرقان حمید کے پیش کردہ دلائل قاہرہ کا استحکام اور انکی عظمت کا صحیح احساس آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ قرآنی دلائل کے مادّوں سے متعلق تھا۔ لیکن فطرت انسانی کے ساتھ قرآن مجید کی یہ ہم آہنگی محض موادِ استدلال ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ

صورت دلیل پر بھی حاوی ہے۔ انسانی فطرت مختلف مواقع پر دلائل کی مختلف صورتوں کو مانگتی ہے کتاب مبین بھی اسکی طلب کا ساتھ دیتی ہے اور جس موقع پر جس صورت دلیل کی وہ مقتضی ہوتی ہے اس موقع پر یہ اسی صورت کو اختیار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم قرآن حکیم میں ہر ایک منطقی اور جدلی طرز استدلال کو پاؤ گے۔ یہ اقتدار فی نفسہٖ کوئی کمال نہیں ہے۔ قرآن حکیم کا کمال یہ ہے کہ اس نے جس موقع پر جو صورتِ دلیل اختیار کی ہے اُس موقع کے لیے اُس سے بہتر تو کیا اسکے مثل بھی کوئی صورت استدلال موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جہاں جو صورت اختیار کرتا ہے وہاں فطرتِ انسانی بھی اس کے انتخاب کی داد دیتی ہے۔ نمونہ کے طور پر ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

حشر و نشر پر استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

تم زمین کو دیکھتے ہو کہ سوکھی پڑی ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی اور پھولتی ہے اور ہر قسم کے خوشنما نباتات اگاتی ہے یہ سب اسلیے ہوتا ہے کہ صرف حق تعالیٰ ہی کی ہستی کامل ہستی ہے اور وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

احتجاج مشرکین کے مقابلہ میں ہے۔ مشرک انتہائی وہم پرست ہوتا ہے بلکہ شرک خود قوت واہمہ کی مخلوق ہے۔ اگر مشرک عقل خالص سے کام لے اور اپنی قوت واہمہ کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ شرک کی نجاستوں سے پاک ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید مشرک کی اس ذہنی پستی کو سمجھتا ہے اور اُسکو اس پستی سے نکالکر علم اور عقل کی بلندی کی طرف لیجانا چاہتا ہے اسلیے وہ نہ صرف یہ کہ دلیل کے مقدمات ایسے لاتا ہے جن میں فہم خالص کا کام ہو بلکہ صورت دلیل بھی ایسی اختیار کرتا ہے جس کو عقل خالص اور فہم محض آسانی کے ساتھ اور جلدی قبول کرے تاکہ قوت واہمہ کا غلبہ دور ہو اور اس کی تاریکیوں میں گھری ہوئی عقل روشنی میں نکل کر حقیقت کا خود ادراک کرلے۔ ایسے موقع پر صورت

دلیل قیاس سے بہتر اور کون سی ہو سکتی تھی؟

مگر دوسری جگہ دیکھیے۔ جہاں نصاریٰ کے مقابلہ میں احتجاج کیا گیا ہے وہاں دلیل کو تمثیل کا لباس پہنایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّمَا مَثَلُ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ۔ بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔

ایک آسمانی کتاب ہاتھ میں رکھنے کے باوجود شرک میں گرفتار ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ مخاطب کی قوت واہمہ اسکی عقل پر اس درجہ غالب و مستولی ہو چکی ہے کہ اس میں خالص عقلی شئے کے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔ اس لیے ضرورت اس کی ہوئی کہ دوا اسی راستہ سے پہنچائی جائے جس راستہ سے مرض کے جراثیم داخل ہوئے ہیں اور جس راستہ سے اُنکے طبائع دلیل سے زیادہ اور جلدی متاثر ہو سکیں۔ اُنہوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا اسی لیے تو قرار دیا تھا کہ ان کا بے باپ کے پیدا ہونا انکے نزدیک عجوبہ تھا۔ لہذا ان کے اسی وہم کے راستہ سے دوا پہنچائی گئی کہ اگر عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو آدم تو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔ پھر جب تم نے ان کو خدا کا بیٹا نہ قرار دیا تو عیسیٰ کے بارے میں کیوں ایسا غلط عقیدہ قائم کر لیا۔

دیکھیے دونوں جگہ صورت دلیل موقع کے لحاظ سے کس قدر مناسب ہے اور مخاطب کی ذہنی حالت سے کیسی مطابقت رکھتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے قرآنی طرزِ استدلال و تفکر پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا کا طرزِ استدلال اور نہج فکر کسقدر غلط، گمراہ کن اور فطری نہج فکر سے ہٹا ہوا ہے۔ گمراہی و ضلالت کا حقیقی سبب یہی نہج فکر اور طریق استنتاج کی غلطی ہے۔ اگر فطری طرزِ استدلال

و تفکر کو اختیار کیا جائے تو دنیا کا کوئی نظریہ قرآنی تعلیمات کے خلاف نہیں جا سکتا اور حیوانیت و بہیمیت کو وہ فروغ کبھی نہیں ہو سکتا جو آج دنیا میں ہو رہا ہے - لیکن افسوس ہے کہ آج خود مسلمان اسلامی نہج فکر کو چھوڑ کر غیر اسلامی طرز فکر اختیار کیے ہوئے ہیں - حالانکہ ان کے پاس وہ کتاب موجود ہے جو صحیح اور فطری طرز فکر و استدلال کی تعلیم انسان کو دیتی ہے -

---



# ہمارا کتب خانہ

| | | |
|---|---|---|
| الجہاد فی الاسلام | : | ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بے جلد چار روپے مجلد پانچ روپے ۵ر |
| تنقیحات | : | ضخامت ۲۴۰ صفحات " " ۱۲ار " ایک روپیہ ۴ر |
| رسالہ دینیات | : | " ۱۳۶ " " " ۱۰ار " چودہ آنے |
| سیاسی کشمکش حصہ اول | : | " ۱۰۴ " قیمت ۴ر آنے |
| " دوم | : | " ۲۴۰ " " آٹھ آنے |
| مسئلہ قومیت | : | " ۶۴ " " چار آنے |

سیاسی کشمکش ہر دو حصہ :
مع مسئلہ قومیت : } قیمت مجلد ایک روپیہ ۸ر

سید البشر : مصنفہ مولوی ابو سعید عبدالرحمن فریدکوٹی قیمت بے جلد ۶ر محصول ڈاک ۱ر

سیرت پاک رسول : قیمت بے جلد ۴ر
ہمارے نبی کی صحابہ : قیمت بے جلد ۸ر

مطالب القرآن حصہ اول : سید محمد شاہ ایم - اے کے قلم سے قرآن پاک کے پہلے ساڑھے پانچ پاروں کا مفہوم آسان اور سلیس اردو میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر طبقے کے اردو داں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ہدیہ بے جلد عہ ر مجلد للعہ

دفتر ترجمان القرآن - پونچھ روڈ - مبارک پارک - لاہور